وحدت الوجود اور فلسفۂ خودی*

ڈاکٹر ابو سعید نور الدین

یہ ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ بعض شارحین اقبال شاعر مشرق علامہ اقبال کے فلسفہ اور خیالات کی ایسی توضیحات کر رہے ہیں، جن سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ گویا علامہ اقبال بھی عقیدۂ وحدت الوجود کے حامی تھے۔ حالانکہ حقیقت اسکے بالکل برعکس ہے۔ خودی کا تصور جو علامہ اقبال نے پیش کیا ہے وحدت الوجود کے معروف اور اصطلاحی تصور کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ مجھے امید ہے کہ سطور ذیل سے قارئین پر یہ حقیقت آسانی سے منکشف ہو جائیگی۔

(۲)

''خودی،، خود علامہ اقبال کے الفاظ میں ایک ''وحدت وجدانی یا شعور کا وہ روشن نقطہ ہے، جس سے تمام انسانی تخیلات مستنیر ہوتے ہیں،،۔ یہ ایک لازوال حقیقت ہے، جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے، یہ انسان کے اندر ایک قوت خاموش ہے جو عمل کے لئے بیتاب ہے :

قوت خاموش و بیتاب عمل   از عمل پابند اسباب عمل

اس کا مقام انسان کے دل کے اندر ہے :

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے   فلک جسطرح آنکھ کے تل میں ہے

''خودی،، کا لفظ مستند لغتوں میں حسب ذیل معنی میں آیا ہے :

۱— فرهنگ انند راج : انانیت و خود پرستی و خویشتن پرستی۔

۲— نور اللغات : (انانیت۔ خود پرستی) (الف) خود مختاری، خود سری، خود رائی — (ب) خود غرضی — (ج) غرور، نخوت۔ تکبر۔

۳— STEINGASS: 1 Selfishness, 2 Conceit, 3 Egotism

ادبیات فارسی و اردو میں ''خودی،، کا لفظ عموماً غرور، نخوت، تکبر کے معنوں

---

* اس مضمون کا بیشتر حصہ میری کتاب علامہ اقبال اور تصوف سے ماخوذ ہے۔

میں استعمال ہوا ہے۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

مولانا جلال الدین رومی رح کا شعر ہے :

پس خودی را سر ببر با ذوالفقار　　　بیخودی شو فانی و درویش وار

فخر الدین رازی کہتے ہیں :

اول اینست و آخرش دانی چیست　　　خود راز خودیٔ خود بپرداختن است

مولانا جامی کو سنئے :

چو تیغ تہمت و تیر جفا خورم ز حسود　　　بشست ترک خودی به نیستی سپرم

اردو کے مشہور شاعر سودا کا ایک شعر ہے :

ہائے پہنچا نہ گیا قید خودی سے اس تک
اپنے ہی دام سے چھٹنا مجھے دشوار ہوا

لسان العصر اکبر الہ آبادی نغمہ زن ہیں :

کہہ دیا میں نے کہ ہوں اور یہ نہیں سمجھا کہ کیا
اس خودی کا حشر کیا ہوتا ہے، دیکھا چاہئے

مٹا دو رنگ وحدت میں خودی کا رنگ اے اکبر
اگر ثابت کیا چاہو تم اپنا معتبر ہونا

ترک خودی سے مائل پندار ہو گئے　　　آزاد ہونے ہوتے گرفتار ہوگئے

اوپر فارسی اور اردو شعراء کے جو چند اشعار پیش کئے گئے، ان میں ''خودی،، کا لفظ مثبت کی بجائے منفی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں ''مدح،، نہیں بلکہ ''ذم،، کا پہلو اجاگر ہے۔ اس لئے جہاں تک ہوسکے، خودی کو مٹانا اور اس سے گریز کرنا ہی اولیٰ تصور کیا گیا۔

البتہ مولانا جلال الدین رومی رح نے اپنی شہرۂ آفاق مثنوی میں لفظ ''خودی،، کو مذکورۂ بالا عام معنوں سے ہٹ کر بھی استعمال کیا ہے۔ انہوں نے اس لفظ سے انانیت، خود پرستی، غرور، نخوت، تکبر، خود سری

و خود رائی کے علاوہ عرفان نفس، ہوشیاری اور خود داری کا مفہوم بھی لیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں :

با خودی تو لیک مجنون بیخود است، در طریق عشق بیداری بد است
با خودی بابے خودی دو چار زد بیخود اندر دیدۂ خود خار زد
می گریزند از خودی در بیخودی یا بمستی یا بشغل ای مہتدی

یہ تو رہا لفظ ''خودی،، کا استعمال۔ مولانا رومی رح کے ہاں معنوی طور پر بھی ''خودی،، کا تصور پایا جاتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے، وہ خود شناسی اور خود داری کو خاصی اہمیت دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو :

صد ہزاران فصل داند از علوم جان خود را می نداند آن ظلوم
داند او خاصیت ہر جوہرے در بیان جوہر خود چون خرے
قیمت ہرکالہ می دانی کہ چیست قیمت خود را ندانی زا حمقیست

مولانا رومی رح کے ہاں ''خودی،، کا بھی مثبت مفہوم تھا، جس سے علامہ اقبال نے اپنے خاص فلسفۂ حیات کا دیا جلایا اور پورے عالم کو روشن کرنے کی کوشش کی۔ اسی بنا پر وہ مولانا رومی رح کو اپنا پیر و مرشد اور روحانی پیشوا مانتے ہیں۔ اور اپنے کلام میں بار بار نہایت عقیدت مندانہ طور پر اقرار کرتے ہیں کہ میں نے مولانا رومی سے بہت فیض حاصل کیا ہے۔ چنانچہ ''اسرار خودی،، میں ''خودی،، کا نظریہ پیش کرنے سے پہلے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

باز بر خوانم ز فیض پیر روم دفتر سربستہ اسرار علوم
جان او از شعلہ ھا سرمایہ دار من فروغ یک نفس مثل شرار

لیکن مولانا رومی رح کے ہاں ''خودی،، کا یہ مفہوم اس قدر عام نہ تھا۔ اس لئے کہ ان کا عام میلان وحدت الوجود کی طرف تھا۔ اور وہ ''خودی،، کے مقابلہ میں ''بیخودی،، ھی کی دنیا کو زیادہ ترجیح دیتے تھے۔ پھر بھی ان جیسی عظیم شخصیت ''خودی،، کی اس زندہ حقیقت سے کب بے نیاز رہ سکتی تھی۔ چنانچہ ان کی مثنوی میں، جس کو ''قرآن در زبان پہلوی،، کہا جاتا ہے، صدھا جواہر پاروں کے ساتھ ''خودی،، کا وہ جدید مفہوم بھی پایا جاتا ہے، جس کے علامہ اقبال علمبردار ہیں۔ یوں کہئے کہ انہوں نے ''نشان راہ،،

بتا کر ''خودی،، کی اس زندہ مگر گمشدہ حقیقت کو بے نقاب کرکے درجۂ کمال تک پہنچانے کا فرض اپنے روحانی مرید علامہ اقبال کے ذمہ چھوڑا۔

فلسفۂ خودی کی تبلیغ و توضیح علامہ اقبال کا خاص مشن تھی۔ اس کے صحیح مفہوم کو دنیا میں بین طور پر پیش کرنے کے لئے انہوں نے اپنی تمام تر قوتیں صرف کر دیں۔ انہوں نے اپنے کلام اور نگارشات میں ''خودی،، کے عنوان پر مختلف پیرایہ میں اس قدر پر زور بحث کی ہے کہ یہ نظریہ خاص ان ہی کا ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کی ساری تعلیمات کا محور گویا یہی ایک نظریہ ہے۔

چونکہ لفظ ''خودی،، کے مروجہ معنوں کے پیش نظر، جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے، لوگوں کو غلط فہمی ہو سکتی تھی، چنانچہ بعض کو ہوئی بھی، اور اب تک ہو رہی ہے۔ اس لئے علامہ اقبال نے خود یہ واضح کر دیا کہ اس لفظ سے ان کی مراد غرور و نخوت نہیں ہے، بلکہ اس کا واحد مقصد وہ عرفان نفس و خود شناسی ہے، جس کی بدولت انسان اپنی حقیقی قدر و قیمت پہچان سکتا ہے، اور اس کو خدا تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نیابت الہیہ اور کھوئی ہوئی عظمت و شوکت مل سکتی ہے۔

علامہ اقبال ''اسرار خودی،، کے پہلے ایڈیشن کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں :

> ''ہاں، لفظ ''خودی،، کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی ''غرور،، استعمال نہیں کیا گیا، جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساس نفس یا تعین ذات ہے،،۔

نیز قاضی نذیر احمد کو ۱۲ مئی ۱۹۳۷ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

> ''اسرار خودی اور رموز بیخودی کا موضوع یہی مسئلہ خودی ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے آپ کو اطمینان ہو جائے گا، اگر ان دونوں میں یا (میری) کسی اور کتاب میں آپ کو کوئی ایسا شعر ملے، جس میں خودی کا مفہوم تکبر یا نخوت لیا گیا ہو، تو اس سے مجھے آگاہ کیجئے گا،،۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ عیاں ہوتا ہے، علامہ اقبال نے لفظ ''خودی،، کو اپنے کلام میں کہیں بھی ''غرور و تکبر،، کے معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے۔ اسی بنا پر وہ ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں :

''خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذت نیاز نہیں،،۔

اس بات کو اسرار و رموز میں ایک دوسرے پیرایہ میں بیان کرتے ہیں :

خویش دار و خویش باز و خویش ساز ناز ہا می پرورد اندر نیاز

(۳)

علامہ اقبال کے نزدیک حیات سر بسر انفرادی ہے۔ بقول ان کے حیات کلی کے نام سے کوئی حیات نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ بھی ایک فرد ہے، البتہ وہ یکتا ترین فرد ہے۔ یہ کائنات افراد کی ایک انجمن ہے۔ یہ کائنات ازل سے کوئی تکمیل شدہ چیز نہیں، بلکہ آہستہ آہستہ درجہ کمال تک پہنچنے کی طرف جا رہی ہے۔

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

علامہ اقبال کے عقیدہ میں کائنات کو درجہ کمال تک پہنچانے کے کام میں انسان بھی ایک حد تک خدا تعالیٰ کے ساتھ شریک کار ہے۔ اس کا ثبوت خود خدا تعالیٰ کا کلام ہے : فتبارک اللہ احسن الخالقین (پس بڑی برکت والا ہے اللہ، جو دوسرے خالقین میں سے احسن ہے)۔ علامہ اقبال کہتے ہیں، اس سے خدا تعالیٰ کے علاوہ دوسرے خالقین کا امکان پایا جاتا ہے، اگرچہ وہ بہت ہی کم درجہ کے کیوں نہ ہوں، اور خدا تعالیٰ، جو احسن الخالقین ہے، اس کے وہ محتاج ہی کیوں نہ رہیں۔ اس لطیف نکتہ کو ''پیام مشرق،، کی ایک نظم بعنوان ''محاورہ ما بین خدا و انسان،، میں نہایت دلپذیر انداز میں پیش کرکے انسانی خودی کے اوصاف کو اس طرح بیان کیا گیا ہے :

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اس لئے انسان کا اخلاق اور مذھبی نصب العین نفیٔ خودی نہیں، بلکہ اثبات خودی ہے ۔ اس کی حیثیت اس قطرۂ بے مایہ کی طرح نہیں ہے، جو دریا میں جا کر فنا ہو جائے، اور اپنی ہستی کو گم کردے، بلکہ اس کی کیفیت اس قطرہ کی سی ہے، جو دریا میں جا کر گوھر بنے ۔ اس لئے انسان کو چاھیئے کہ تخلقوا باخلاق اللہ (اپنے آپ کو صفات الٰہیہ سے متصف کرو) پر عمل کرکے خدائے یکتا سے زیادہ سے زیادہ قربت حاصل کرے ۔ وہ اپنے اس عمل میں اس فرد یکتا سے جس قدر زیادہ قریب ہوتا جائے گا، اسی نسبت سے وہ جہاں میں بیگانہ و یکتا بنتا جائے گا :

اتر گیا جو ترے دل میں لاشریک لہ　　　رہے گا تو ھی جہاں میں یگانہ و یکتا

خودی علامہ اقبال کے نزدیک ایک ایسی قوت ہے، جو عمل سے لازوال ہو سکتی ہے ۔ چونکہ خالق اور مخلوق میں مغایرت ہے، مخلوق اپنی ہستی کو فنا کرکے بھی خالق سے متحد نہیں ھوسکتا ۔ معرفت خدا وندی کی خاطر اگر یہ طریقہ اختیار بھی کیا جائے کہ عارف اپنے آپ کو معروف کی ذات میں گم کردے، تو بھی حقیقت میں عارف و معروف میں فرق باقی رھتا ہے ۔ اور یہی فرق علامہ اقبال کے نزدیک مستحسن ہے :

فراق عارف و معروف خیر است　　　خودی را زندگی ایجاد غیر است

(۴)

علامہ اقبال کا نظریۂ ''خودی،، اصل میں فلسفۂ ''وحدت الوجود،، کے رد عمل کے طور پر وجود میں آیا ہے ۔ ''وحدت الوجود،، کا تعلق اسلامی تصوف سے ہے ۔ اس لحاظ سے کہ اس کو خاص طور پر صوفیائے کبار نے پیش کیا ہے ۔ ورنہ یہ ایک خالص فلسفیانہ مسئلہ ہے ۔ اگرچہ فلسفہ اور تصوف کے درمیان کوئی حد فاصل قائم نہیں کی جا سکتی، لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق اتنا تصوف سے نہیں، جتنا کہ فلسفہ سے ہے ۔ درحقیقت یہ ایک ما بعد الطبیعیاتی مسئلہ ہے، جس کو زمانہ، ماحول اور حالات نے زبردستی تصوف سے لا کر ملا دیا ہے، اور خود تصوف کو جو کہ ایک عملی چیز ہے۔ پیچیدہ اور عسیر الفہم علمی مسئلہ بنا دیا ہے ۔

اسلامی تصوف میں ''وحدت الوجود،، کا فلسفہ ''نو افلاطونیت،، سے داخل ہوا ہے ۔ فلسفۂ ''نو افلاطونیت،، قدیم یونانی فلسفی افلاطون (م ۳۴۷ ق م)

کے افکار و خیالات کی شرح و تفسیر میں تیسری صدی عیسوی میں ایک مستقل اسکول کی شکل میں وجود میں آیا۔ چونکہ ''وحدت الوجود،، کا منبع و ماخذ فلسفہ'' ''نو افلاطونیت،، ہے، اسلئے ضروری ہے، اس کے حسب ذیل خاص خاص اصول بیان کئے جائیں :

۱- ''وجود،، دراصل ''واحد،، ہے، اور وہی ''وجود واحد،، دیگر جملہ موجودات کا منبع ہے۔ تمام کائنات بطریق تجلی اسی ''وجود واحد،، سے نکلی ہے، اور اس کا انجام کار لوٹ کر اسی ''وجود واحد،، میں محو ہو جانا ہے۔ گویا اس ''وجود واحد،، کے سوا کائنات میں جو کچھ بھی ''موجود،، ہے، وہ صرف اس ''وجود واحد،، کی ''نمود،، ہے۔ وہ خود کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا۔

۲- خدا تعالیٰ عین کائنات ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ خود ہی کائنات ہے۔ گویا حقیقت میں ''خدا،، اور ''کائنات،، ایک ہی ہیں۔ خدا کو کسی صفت سے متصف نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کے لئے ہر تعبیر از قبیل ''وجود،، ، ''موجود،، ''جوہر،، و ''حیات،، ناقص ہے۔ وہ ان تمام صفات اور تعبیرات سے منزہ ہے۔ اس کو کسی طرح بھی تصور میں نہیں لایا جا سکتا۔ وہ ہر توصیف و تعبیر سے بالا ہے۔

۳- ''خدا،، کے بارے میں ''فکر،، کو عمل میں نہیں لایا جا سکتا۔ اس لئے کہ ''فکر،، دو چیزوں کی مستلزم ہے، فکر کرنے والا اور 'وہ چیز جس پر فکر کی جائے'۔ نیز ''فکر،، اس امر کا مستلزم ہے کہ ''فکر کرنے والا،، کسی حالت کا طالب ہو، علاوہ اس حالت کے جو خود اس کے اندر موجود ہے۔ اور یہ امر ''دوئی،، کا مستلزم ہے، جو ''خدا،، کی ''وحدانیت،، کے بنیادی عقیدہ کے خلاف ہے۔

۴- ''خدا،، ''واجب الوجود،، ہے، اور بنفسہ ''کامل،، ہے، اور ہر قسم کے تجزیہ اور تعدد سے بری ہے۔ وہ جملہ اشیا کو محیط ہے۔ وہ لا محدود ہے۔ اس کی طرف ہر نسبت عقیدۂ توحید کے خلاف ہے۔ اس کی طرف علم و ادراک کی نسبت بھی غلط اور

منافیٔ توحید ہے۔ اس لئے کہ خود اس کے بغیر کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے کہ معلوم و مدرک ہو۔

۵— حس و عقل کے ذریعہ خدا تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ''مشاہدہ،، اور ''ذوق و شوق،، لازمی ہے۔

(۵)

اسلام نے جب رفتہ رفتہ ترقی کی، اور مسلمانوں نے سر زمین عرب سے نکل کر، شام، عراق، ایران، فلسطین، مصر وغیرہ کو فتح کیا۔ تو ان ممالک میں ''نو افلاطونیت،، کے مندرجۂ بالا اصول جاری و ساری تھے۔ عباسیوں کے عہد خلافت (۱۳۲ھ — ۶۵۶ھ / ۷۵۰ء — ۱۲۵۸ء) خصوصاً المامون (۱۹۸ھ — ۲۱۸ھ / ۸۱۳ء — ۸۳۳ء) کے زمانہ میں مسلمان علماء اور فلاسفہ نے مختلف یونانی علوم مثلاً طب، ہیئت، جغرافیہ، ما بعد الطبیعیات، الہیات، نفسیات، منطق، سیاسیات، اخلاق وغیرہ کو عربی قالب میں ڈھالا۔ ان علوم کے ساتھ انہوں نے فلسفۂ ''نو افلاطونیت،، کو بھی اپنایا۔

الکندی (م — ۲۷۰ھ / ۸۸۳ء) پہلا شخص ہے، جو مسلمانوں میں فلسفی کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ افلاطون کا پیرو اور اس کے فلسفہ کا شارح تھا۔ اس کے بعد فلسفۂ افلاطون کے اور بہت سے مفسرین پیدا ہوئے، جن میں الفارابی (۳۳۹ھ / ۹۵۰ء)، ابن مسکویہ (م ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء) اور ابن سینا (م ۴۲۸ھ / ۱۰۳۷ء) زیادہ مشہور ہیں۔

مسلمان مفکرین میں شیخ محی الدین ابن عربی رح (م ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء) پہلے شخص ہیں، جنہوں نے مسئلۂ ''وحدت الوجود،، کو نہایت وضاحت کے ساتھ اسلامی تصوف کے رنگ میں پیش کیا۔ ان کی مساعی سے اس مسئلہ سے متعلق فلسفۂ ''نو افلاطونیت،، کے اصول اسلامی تعلیمات میں اسطرح گھل مل گئے کہ دونوں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ دور ما بعد کے شعراء ادبا اور فلاسفہ نے اس مسئلہ کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا۔ اور اس کے اثرات کو ہمہ گیر بنا دیا۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ اسلام کی اصلی اور بنیادی تعلیم توحید ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو سب سے پہلے اسی عقیدۂ توحید

کی طرف دعوت دی۔ ایام جاہلیت میں اہل عرب تین سو ساٹھ بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلعم کی دعوت توحید اسی کثرت کا رد عمل تھی۔ آپ نے لوگوں کو بتایا کہ جن متعدد مصنوعی خداؤں کی تم پرستش کرتے ہو، وہ سب باطل ہیں۔ حقیقی خدا صرف ایک ہے، اور وہی حقیقی پرستش کے لائق ہے۔

لیکن چونکہ فلسفۂ نو افلاطونیت کا نظریہ ''وحدت الوجود،، اسلام کے عقیدۂ توحید سے مشابہت رکھتا ہے، اس لئے تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) میں صوفیائے اسلام نے اسے اپنایا، اور اس کو توحید کا باطنی پہلو تصور کرکے اسلامی تصوف کا لازمی جزو قرار دیا۔ انہوں نے اس کی ایک ایسی نئی تاویل کی جو ابتدائے اسلام میں موجود نہ تھی، اور اس کی ایسی ایسی توضیحات و تعبیرات پیش کیں کہ تاریخ تصوف اسلام میں یہ ایک مستقل باب بن گیا۔

اسلامی تصوف کی تاریخ میں وہ پہلے بزرگ، جن کی ذات سے نظریہ ''وحدت الوجود،، کے خیالات منسوب ہیں، ذوالنون مصری رح (م ۲۴۵ھ / ۸۵۹ء) ہیں۔ ظہور اسلام سے بہت پہلے اسکندریہ میں فلسفۂ نو افلاطونیت اپنی ترقی کے منازل طے کر چکا تھا، اور ذوالنون مصری رح کے عہد تک اس کے اصول وہاں عام طور پر رائج تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر وہ بھی اسی فلسفہ ''نو افلاطونیت،، سے متاثر ہوئے۔ وہ بڑے روشن خیال فلسفی اور کیمیا دان تھے۔ تصوف میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ فلسفۂ نو افلاطونیت کے افکار و خیالات میں سے سب سے زیادہ وہ نظریہ ''وحدت الوجود،، سے متاثر ہوئے، اور اس کو اسلامی تصوف میں سمویا۔ ان کا ایک قول ہے :

> ''اللہ سے جو محبت کی جاتی ہے، وہ انسان کو انجام کار اس سے متحد کر دیتی ہے۔ انسان ذات خدا وندی میں غرق ہو جاتا ہے۔ اس کی ذات اپنی ذات نہیں رہتی، بلکہ ذات خداوندی کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔،،

ایک مناجات میں کہتے ہیں :

> ''خدایا میں جب بھی جانوروں کی بولیاں، درختوں کی سرسراہٹ، پانی کی آواز، چڑیوں کا گانا، تیز و تند ہوا کی سنسناہٹ اور رعد کی

گرج سنتا ہوں، تو ان میں تیرے ہی عدیم المثال اور عدیم النظیر ہونے کا ثبوت پاتا ہوں۔''

اس قسم کے اقوال سے ''اتحاد''، ''بذات حق''، ''استغراق'' اور ''فنا فی اللہ'' کی طرف ان کا میلان پایا جاتا ہے۔ یہ سب اقوال ''وحدت الوجود'' سے تعلق رکھتے ہیں۔

ذوالنون مصری رح کے بعد بایزید بسطامی رح (م ۲۶۱ھ / ۸۷۵ء) کا ذکر آتا ہے، جنہوں نے نظریہ' ''وحدت الوجود'' سے متعلق گونا گوں افکار و خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اقوال ان سے منسوب ہیں :

۱— ''ایک بار میں نے اسکی بارگاہ میں مناجات کی، خدایا تجھ تک رسائی کیسے ہوگی ؟ آواز آئی، بایزید، پہلے اپنے آپ کو تین طلاق دے، پھر ہمارا نام لے۔''

۲— ''سانپ کے کینچلی اتارنے کی مانند جب میں بایزید سے نکلا تو دیکھا، عاشق و معشوق دونوں ایک ہی (ذات کے دو جلوے) ہیں۔ کیونکہ توحید کے عالم میں ایک ہی کو دیکھا جا سکتا ہے''۔

۳— سبحانی ما اعظم شانی (تعریف میری ہی ہے، کیا بڑی ہے شان میری)۔ یعنی وہ خدا کی ذات میں اسقدر محو ہوگئے کہ ان کو اپنی ہستی کا احساس ہی باقی نہ رہا۔ اور اپنے آپ کو ہستی' مطلق کا عین پایا۔ اس لئے ان کے منہ سے اس قسم کا قول بیساختہ صادر ہوگیا۔

ان کی بدولت نظریہ' ''وحدت الوجود'' نے اس قدر فروغ پایا کہ شریعت سے متصادم نظر آنے لگا۔ اور ارباب شریعت اس قسم کی باتیں کرنے والوں کو حدود شریعت اور صراط مستقیم سے ہٹتے ہوئے دیکھ کر گمراہ اور کافر قرار دینے لگے۔ تصوف اور شریعت میں اس اختلاف اور تصادم نے آگے چل کر حسین بن منصور حلاج رح (م ۳۰۹ھ / ۹۲۱ء) کے زمانہ میں انتہائی شکل اختیار کی۔ اور انجام کار ان کو نہایت دردناک صورت میں دار پر جان دینا پڑی۔

تاریخ تصوف اسلام میں منصور حلاج رح کا واقعہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

ان کا شمار تبع تابعین میں ھوتا ھے۔ توحید کے سلسلہ میں ان کا مسلک بھی ''وحدت الوجود،، تھا یعنی وہ بھی بزعم خود اپنی ذات یا خودی کو ذات الہی میں فنا کرکے اسی کا ایک حصہ یا جز بن گئے تھے۔ وہ کہتے ھیں :

''جو شخص طاعت میں اپنے نفس کو پختہ کر لیتا ھے، اپنے دل کو اعمال و اشغال صالحہ کا خوگر بنا لیتا ھے، ترک لذات کا عادی ھو جاتا ھے، شہوات اور خواھشات نفسانی پر اقتدار حاصل کر لیتا ھے، وہ مقام مقربین تک پہنچ جاتا ھے۔ پھر جب اس کے نفس کا تزکیہ زیادہ ھو جاتا ھے تو بشریت کے حدود سے گزر جاتا ھے، اور جب اس میں بشریت کا شائبہ نہیں رھتا، تو وہ اللہ تعالی کی روح پاک میں تحلیل ھو جاتا ھے، پھر وہ مطیع سے مطاع بن جاتا ھے۔ یعنی وہ روحانیت کی اس منزل پر ارتقا کر جاتا ھے، جہاں وہ کسی کی اطاعت نہیں کرتا۔ بلکہ لوگ اس کی اطاعت کرنے لگتے ھیں۔ پھر وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ھے، وھی واقع ھوتی ھے، جو پہلے سے مشیت الہی بن چکی ھوتی ھے۔ پھر اس کا کوئی قول اور کوئی فعل اس کا نہیں رھتا، بلکہ خدا کا قول و فعل بن جاتا ھے۔،،

منصور حلاج رح نے جب مذکورہ بالا خیالات کا اظہار کیا، تو شریعت سے ان کا تصادم لازمی اور لابدی تھا۔ چنانچہ واقعتاً ایسا ھی ھوا۔ اھل شریعت نے ان پر کفر و الحاد کا فتویٰ لگایا، اور اتحاد بذات حق اور حلول کے قائل ھونے کی بنا پر زندیق کا خطاب دیا۔ اس جرم میں فقہا نے بالاتفاق ان کے لئے سزائے موت کا فتویٰ دیا، اور ۱۸ ذی قعدہ ۳۰۹ھ / ۹۲۱ء کو ان کو سولی پر چڑھا کر ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا۔

(٦)

تاھم اس دور تک اسلامی تصوف میں نظریۂ ''وحدت الوجود،، کو اتنی اھمیت حاصل نہیں ھوئی تھی، بلکہ ابھی تک وہ ابتدائی حالت ھی میں تھا۔ شیخ محی الدین ابن عربی رح (م ٦٣٨ھ / ۱۲۴۰ء) پہلے شخص ھیں، جنہوں نے اس مسئلہ کو نہایت وضاحت کے ساتھ اسلامی تصوف کے رنگ میں پیش کیا۔ ان کی کوششوں سے اس مسئلہ سے متعلق فلسفۂ نو افلاطونیت کے اصول اسلام میں داخل ھوئے۔ وہ ایک کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ ''فتوحات مکیہ،، اور ''فصوص الحکم،، ان کی مشہور تصنیفات میں سے ھیں۔

موخر الذکر کتاب میں انہوں نے ''وحدت الوجود،، پر مفصل بحث کی ہے۔

توحید کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ ہے :

''وجود واحد ہے، اور مخلوقات کا وجود عین وجود خالق ہے۔
حقیقت کے اعتبار سے خالق اور مخلوق میں کوئی فرق نہیں ہے۔
جو شخص خالق اور مخلوق کے وجود میں امتیاز کا قائل ہے،
وہ اس حقیقت کے ادراک سے نا آشنائے محض ہے،،۔

ان کے نزدیک ''عالم،، اور ''خدا،، کی نسبت ''عینیت،، کی نسبت ہے۔ اس ''عینیت،، کا اثبات یا تو وہ وجود عالم کی نفی سے کرتے ہیں، یا خدا کے اثبات سے۔ پہلی صورت میں وہ کہتے ہیں : ''عالم کا وجود محض برائے نام، وھمی اور غیر حقیقی ہے۔ وہ خارج میں معدوم ہے،،۔ ان کا قول ہے : الاعیان ما شمت رائحۃ الوجود (اعیان ثابتہ نے وجود خارجی کی بو تک نہیں سونگھی)۔ دوسری صورت میں وہ کہتے ہیں : ''عالم ہی خدا ہے۔ یہ اسی ذات واحد کی تجلی ہے، جس میں اس وحدت نے اپنے آپ کو نمودار کیا۔ ان تجلیات میں وحدت کلی طور پر گم ہو جاتی ہے۔ ان تجلیات کے ماوراء وحدت کا الگ اور کوئی وجود نہیں۔ ان کا قول ہے : ما بعد ھذا الا العدم المحض (ان تجلیات کے ماوراء عدم محض کے علاوہ اور کچھ نہیں)۔ اسلئے سالک کیلئے اس عالم سے ماوراء خدا کی جستجو بے کار ہے،،۔

محی الدین ابن عربی رح اس بات پر غایت اذعان و ایقان کے ساتھ مصر ہیں کہ ''وحدت الوجود،، ہی دراصل اسلام کی حقیقت ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں انہوں نے قرآن اور حدیث سے متعدد دلائل و شواھد پیش کئے۔ وہ کہتے ہیں : ونحن اقرب الیہ من حبل الورید (اور ھم اسکی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں) سے مراد اسکے سوا کچھ نہیں کہ خدا خود بندہ کے اعضا و جوارح ہے۔ نیز حدیث شریف میں آیا ہے : خلق الآدم علی صورتہ (آدم کو اپنی ہی صورت پر پیدا کیا)۔ ان کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان میں خدا کی تمام صفات موجود ہیں۔ درحقیقت یہ اس کی صفات ہیں، جن کا ظہور انسان میں ہوا ہے۔ اس لحاظ سے انسان گویا صفات الہیہ کا مجسمہ ہے۔

(۷)

''وحدت الوجود،، سے متعلق شیخ محی الدین ابن عربی رح کے مندرجہ بالا

خیالات نے ان کے ہم عصر اور زمانہ' مابعد کے صوفیا پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ رفتہ رفتہ یہ خیالات اسلامی ممالک میں اس قدر عام ہوگئے کہ قطع نظر صوفیا کے، عربی، فارسی، اردو اور دیگر زبانوں کے متصوفین شعراء بھی ''وحدت الوجود،، کی زد میں آگئے۔ ان لوگوں نے اپنی شاعری میں اس ہمہ گیر نظریہ کو نہایت آب و تاب کے ساتھ پیش کیا۔ جس سے بڑے مضر اثرات مرتب ہوئے، اور عالم اسلام میں عقیدۂ توحید کی اصلی روح فوت ہوگئی۔

علامہ اقبال نے اس نظریہ' ''وحدت الوجود،، کے خلاف نہایت جرأت کے ساتھ آواز بلند کی، اور اس کے رد عمل کے طور پر، جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے، دنیا کے سامنے ''خودی،، کے نام سے اپنا جدید نظریہ پیش کیا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں بتایا کہ نظریہ' ''وحدت الوجود،، ، جو شیخ محی الدین ابن عربی رح کی بدولت اسلام میں عام ہوا ہے، غلط ہے، اور حقیقت کے خلاف ہے۔ انسان، انسان ہے، اور خدا خدا۔ ایک خالق ہے، دوسرا مخلوق۔ دونوں کا حیات کے کسی مرحلہ پر بھی اتحاد وجود میں نہیں آ سکتا۔ انسان کی اپنی بالکل جداگانہ شخصیت ہے۔ وہ انفرادی زندگی کا مالک ہے وہ تخلقوا باخلاق اللہ پر عمل کرکے اپنی شخصیت اور انفرادیت کو جس قدر بڑھاتا ہے، اسی قدر وہ درجہ' کمال کو پہنچتا ہے۔ انجام کار وہ انسان کامل کے منصب عظمی پر فائز ہوتا ہے۔ اسوقت اسکے اشارہ سے ہوا کا رخ بدل جاتا ہے۔ سمندر میں عجیب و غریب تغیرات رونما ہوتے ہیں، آسمان پر روشن و تاباں چاند شق ہو جاتا ہے۔ ایک ٹکڑا کہیں گرتا ہے، دوسرا کہیں اور۔ اسوقت خدا اس کی بات کا لحاظ کرتا ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف کوئی امر صادر نہیں کرتا۔ یہ اصل میں انسان کی ''خودی،، کی عظمت اور بلندی کا کرشمہ ہے۔ اسی بنا پر علامہ اقبال بہانگ دھل پکار اٹھتے ہیں :

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

انسان کا مرتبہ اصل میں اسلام کی تعلیمات کے مطابق یہی ہے۔ شیخ محی الدین ابن عربی رح کی وساطت سے ''نو افلاطونیت،، کے خاص مسئلہ' ''وحدت الوجود،، نے اس کو تباہ کیا۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں :

''اسی نقطہ' خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی، جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر

نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ ''وحدت الوجود،، کو، جس کے وہ انتھک مفسر تھے، اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔ اوحد الدین کرمانی (م ۶۹۷ھ / ۱۲۹۸ء) اور فخر الدین عراقی (م ۶۸۶ھ / ۱۲۸۷ء) ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے۔ اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعراء اس رنگ میں رنگین ہو گئے،،۔

علامہ اقبال نے ''وحدت الوجود،، کے اثرات کے خلاف سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ وہ مولانا اسلم جیراج پوری کو ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں :

''تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہی مفہوم قرون اولیٰ میں پایا جاتا تھا)، تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔ ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے، . . . . . . اور نظامِ عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کرکے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے، تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے،،۔

اسی بنا پر انہوں نے شیخ محی الدین ابن عربی رح پر نہایت تلخ لہجہ میں تنقید کی۔ سراج الدین پال کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

''تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے، جس نے ''لمعات،، میں ''فصوص الحکم،، محی الدین ابن عربی کی تعلیموں کو نظم کیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، فصوص میں سوائے الحاد اور زندقہ کے اور کچھ نہیں،،۔

(۸)

علامہ اقبال کے خیال میں مسئلہ ''وحدت الوجود،، کا اصل منبع و ماخذ افلاطون یونانی کا نظریہ ''تصورات،، ہے، جس کو صوفیاء اعیان ثابتہ کا متصوفانہ نام دے کر اسلامی رنگ دیتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے افلاطون کی سخت مخالفت کی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے، ''اسرار خودی،، میں

''شیر اور گوسفند،، کے عنوان سے ایک حکایت نظم کی ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ گوسفند نے ''شیر،، کو کس قدر لطیف پیرایہ میں ''نفیٔ خودی،، کی تعلیم دی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بتایا، افلاطون نے بھی دنیا کے سامنے اپنا نظریۂ تصورات، پیش کرکے بھی ''مسلک گوسفندی،، اختیار کیا ہے۔ اسلئے اسکے خیالات سے احتراز واجب ہے۔

اس حکایت میں علامہ اقبال نے بالاختصار افلاطون کے بنیادی فلسفہ پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا یہ شعر غورطلب ہے :

رخش او در ظلمت معقول گم　　　در کہستان وجود افگندہ سم

یعنی افلاطون کا سمند خیال ''معقولات،، کے ظلمت کدہ میں گم ہے۔ اس کے ہاں صرف تصورات ہی تصورات ہیں۔ ''کہستان وجود،، میں اس کا سمند خیال نہیں چل سکتا۔ یہاں وہ کلی طور پر عاجز نظر آتا ہے۔ اس کے ہاں اگر کسی چیز کا وجود ہے، تو محض تصورات کا ہے۔ افلاطون کا یہ مسلک ''مسلک گوسفندی،، ہے، جس سے صوفیائے اسلام بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

گوسفندے در لباس آدم است　　　حکم او بر جان صوفی محکم است

افلاطون کا ''مسلک گوسفندی،، اختیار کرنے سے مسلمان اپنی اس ''خودی،، سے بیگانہ ہوگیا جس سے اس نے کائنات کے ایک بڑے حصہ کو مسخر کیا تھا۔ علامہ اقبال نے مسلمان کو ''خودی،، اور اس کے بے پناہ قوت سے آگاہ کرنے اور اس کے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اپنی گراں مایہ زندگی صرف کر دی۔

(۹)

علامہ اقبال عالم اسلام میں ایک غیر معمولی دل و دماغ لے کر آئے تھے۔ انہوں نے تاریخ تمدن اسلام کا بغور مطالعہ کیا، تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کی پستی و زوال کا سبب نفیٔ خودی اور وہ سلبی تعلیمات ہیں، جو نظریۂ ''وحدت الوجود،، کی بدولت وجود میں آئیں۔ مسلمانوں نے اپنی ''خودی،، کا انکار و دیگر منفی تعلیمات کو اختیار کرکے اپنی عظمت، شوکت اور استقلال کو کھو دیا۔

علامہ اقبال نے اس بات پر زور دیا کہ مسلمان اپنی ''خودی،، کا احساس کرے، اور اس کی باضابطہ تربیت کے بعد نیابت الٰہی کا وہ درجہ حاصل کرے، جس کے لئے وہ دنیا میں بھیجا گیا ہے ۔ ''انی جاعل فی الارض خلیفۃ،، ۔

صوفیا نے نظریہ' ''وحدت الوجود،، کی رو سے معرفت خداوندی کیلئے یہ تلقین کی کہ انسان اپنی خودی کو ذات خداوندی میں فنا کردے، لیکن اس کے برخلاف علامہ اقبال نے یہ تعلیم دی کہ ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ،، پر عمل پیرا ہو کر اپنی ''خودی،، کا صحیح احساس اور اس کی کما حقہ معرفت حاصل کرے۔ پھر خدا کی معرفت حاصل کرے۔ ان کے نزدیک خدا کی معرفت ''خودی،، کی معرفت پر موقوف ہے ۔ گویا ''خودی،، کی معرفت کے بغیر ''خدا،، کی معرفت ممکن نہیں ۔

شیخ محی الدین ابن عربی رح کے ہاں اگر ساری تعلیمات کی بنیاد ''وحدت الوجود،، تھی، اور اس لئے خدا کی معرفت اس بات پر مبنی قرار دی گئی تھی کہ انسان اپنی ''خودی،، کو فنا کرکے ذات خداوندی میں گم ہو جائے، تو ''خودی،، کے پیغمبر علامہ اقبال کی ساری تعلیمات کی بنیاد ''خودی،، قرار پائی، اور اس لئے خدا کی معرفت اس امر پر موقوف ہوئی کہ انسان اپنی ''خودی،، کا صحیح احساس کرے، ''خودی،، کو برقرار رکھے اور مستحکم بنائے۔ ان کے ہاں اسطرح ''خودی،، اور ''خدا،، لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں ۔

از ہمہ کس کنارہ گیر، صحبت آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب، ہم ز خودی خدا طلب

*　　*　　*　　*

خودی میں گم ہے خدائی، تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لئے اب صلاح کار کی راہ

''نو افلاطونیت،، کے مسئلہ' ''وحدت الوجود،، سے متاثر ہو کر جہاں دوسرے صوفیا خدا کی معرفت حاصل کرنے کی غرض سے اپنی ''خودی،، کو ''بحر وحدت،، میں گم کر دینے کے قائل ہیں، وہاں علامہ اقبال اپنی ''خودی،، کو ''بحر وحدت،، میں فنا کرکے نہیں، بلکہ اس سے الگ ایک مستقل حیثیت میں برقرار رکھ کر ''حیات جاودانی،، حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔ حتی کہ وہ صوفیا کے عام عقیدہ کے برخلاف ''خدا،، میں جذب ہونے کی بجائے، خود

''خدا،، کو اپنے اندر جذب کر لینے کے قائل ہیں :

مسافر جاودان زی، جاودان میر | جہانے را کہ پیش آید فرا گیر
به بحرش گم شدن انجام ما نیست | اگر اورا تو در گیری، فنا نیست
خودی اندر خودی گنجد محال است | خودی را عین خود بودن کمال است

علامہ اقبال اس شخص کو والہانہ انداز میں مبارک باد دیتے ہیں، جو ''بحر وحدت،، میں گم ہو جانے کی کوشش کرنے کی بجائے اپنی مستقل اور انفرادی شخصیت کو برقرار رکھ کر اپنے وجود کا ثبوت دیتے ہیں :

اے خوش آن جوئے تنک مایہ کہ از ذوق خودی
در دل خاک فرو رفت و بدریا نرسید

مولانا رومی رح کا شعر ہے :

سینہ خواهم شرحه شرحه از فراق | تا بگویم شرح درد اشتیاق

یعنی وہ ایک ایسے آدمی کی تلاش میں ہیں، جس کا دل ان کی طرح درد فراق سے پارہ پارہ ہو چکا ہو، اور خدا سے وصال کیلئے بے چین ہو، تا کہ وہ اس سے اپنا درد اشتیاق (وصال) بیان کر سکیں ۔

اس لئے کہ :

ھر کسے کودور ماند از اصل خویش | باز جوید روزگار وصل خویش

مولانا رومی رح کی طرح دوسرے صوفیا بھی درد فراق سے نالاں ہوکر وصال باری تعالیٰ کے شدت سے متمنی ہوتے ہیں ۔ اسلئے وہ سب اپنے آپ کو فنا کرکے خدا میں فنا ہو جانے کیلئے بے چین رہتے ہیں ۔

لیکن چونکہ علامہ اقبال کا فلسفہ حیات ان صوفیائے کرام کے تصور زندگی سے بالکل مختلف ہے، اسلئے وہ خدا سے وصال کی بجائے فراق کے طالب ہیں ۔ مبادا ان کی ''خودی،، فنا ہو جائے ۔ وہ اس وصل سے کوسوں دور بھاگتے ہیں، جس سے ان کی انفرادی زندگی ختم ہو جانے کا اندیشہ ہو ۔

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھکے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو، ھجر میں لذت طلب

* * *

اے کہ نزدیک تر از جانی و پنہان زنگہ
ہجر تو خوشترم آید ز وصال دگران

*　　　*　　　*

وصل اگر پایان شوق است، الحذر
اے خنک آہ و فغان بے اثر

(۱۰)

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رح نے بھی، جو برصغیر پاک و ہند کے ایک بہت بڑے صوفی گذرے ہیں، شیخ محی الدین ابن عربی رح کے نظریہ ''وحدت الوجود،، پر سخت تنقید کی ہے۔ انہوں نے بڑی شد و مد کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ سلوک میں سالک کی آخری منزل، جیسا کہ عام طور پر صوفیا کا عقیدہ ہے، ''وحدت الوجود،، نہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے اور ایک منزل ہے، جسے ''مقام عبدیت،، کہنا چاہئے۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں پہنچ کر سالک پر یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ وہ ایک بندۂ محض ہے۔ ''وحدت الوجود،، کے تصور سے اس پر خدا سے اتحاد و اتصال کی جو کیفیت طاری ہوتی ہے، وہ کوئی دائمی کیفیت نہیں ہے، بلکہ عارضی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ بندہ بندہ ہے، اور خدا، خدا۔

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رح کے اس نقطۂ نظر سے علامہ اقبال بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ وہ اپنی ''خودی،، کو فنا کرکے ''خدا،، یا ''انائے مطلق،، میں ضم ہو جانے کے ہرگز قائل نہیں، اور ''مقام عبدیت،، یا ''مقام بندگی،، کو ترک کرکے ''شان خداوندی،، قبول کرنے کیلئے قطعاً راضی نہیں۔

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

عطا کن شور رومی، سوز خسرو　　عطا کن صدق و اخلاص سنائی
چناں با بندگی در ساختم من　　نہ گیرم گر مرا بخشی خدائی

علامہ اقبال ''مقام عبدیت،، کو حیات انسانی میں اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ ان کے عقیدہ میں یہ ''مقام عبدیت،، محکم ہو جائے، تو فقیر ''بادشاہ،، بن جاتا ہے۔

چوں مقام عبدہ محکم شود　　کاسۂ دریوزہ جام جم شود

(۱۱)

''وحدت الوجود،، کے زیر اثر صوفیا کائنات کی نفی کے ساتھ ساتھ، اپنی ہستی کو بھی ہیچ قرار دیتے ہیں۔ ان کے عقیدہ میں ''حیات انسانی،، کی غایت خدا یا ہستیٔ مطلق میں ''فنا،، ہو کر ''بقا،، کا درجہ حاصل کرنا ہے۔ لیکن علامہ اقبال ان سے اس بات میں بالکل مختلف ہیں۔ وہ اس معاملہ میں بالکل الگ راہ اختیار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، انسان کی ہستی ''حق،، ہے۔

از خود اندیش و ازیں بادیہ ترسان مگذر
کہ تو ہستی و وجود دو جہاں چیزے نیست

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمود سیمیائی

حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا
تو ہے، تجھے جو کچھ نظر آتا ہے، نہیں ہے

حیات انسانی اسقدر حق ہے کہ ان کے خیال میں خدا کا منکر ملا کے نزدیک اگر کافر ہے، تو خود اپنی ذات کا منکر کافر تر ہے۔

منکر حق نزد ملا کافر است　　منکر خود نزد من کافر تر است

(۱۲)

علامہ اقبال انسانی عظمت و شرافت کو بین طور پر پیش کرنے کیلئے انسانی ''خودی،، کے مستقل وجود کے قائل تھے، وہ کسی حالت میں بھی اس ''متاع بے بہا،، کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ وہ ہر اس چیز اور اس بات سے اختلاف کرتے ہیں، جس سے ان کی ''خودی،، کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ چنانچہ وہ اسی بنا پر ''فنا و بقا،، کی عام صوفیانہ تعبیر سے اتفاق نہیں کرتے۔ ''فنا و بقا،، کے قائل وہ بھی ہیں، لیکن ان کے نزدیک ''فنا و بقا،، ذات خداوندی میں نہیں، بلکہ احکام الٰہی کی کامل پابندی میں ہے۔ اکبر الہ آبادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

''حقیقی اسلامی بیخودی (فنا) میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات، رجحانات و تخیلات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے

احکام کا پابند ہو جانا ہے ۔ اسطرح کہ اس پابندی کے نتائج سے انسان بالکل لا پروا ہو جائے، اور محض رضا و تسلیم کو اپنا شعار بنائے ۔ یہی اسلامی تصوف کے نزدیک 'فنا، ہے،، ۔

مولوی ظفر احمد صدیقی کو رقمطراز ہیں :

''بہرحال حدود ''خودی،، کے تعین کا نام ''شریعت،، ہے، اور ''شریعت،، کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام ''طریقت،، ہے ۔ جب احکام الٰہی ''خودی،، میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ ''خودی،، کے پرائیویٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں ، اور صرف ''رضائے الٰہی،، اس کا مقصد ہو، تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے ''فنا،، کہا ہے، بعض نے اسی کا نام ''بقا،، رکھا ہے،، ۔

علامہ اقبال احکام الٰہی میں فنا ہونے کا طریقہ یہ بتاتے ہیں :

اندر کے اندر حرائے دل نشین ترک خود کن، سوئے حق ہجرت گزین
محکم از حق شو سوئے خود گام زن لات و عزائے ہوس را سر شکن

احکام الٰہی کی بجائے ذات خداوندی میں ''فنا،، ہونے کے متعلق وہ لکھتے ہیں :

''دوسری وہ ''بیخودی،، ہے، جو بعض صوفیائے اسلامیہ اور تمام ہندو جوگیوں کے نزدیک، ''ذات انسانی،، کو ''ذات باری،، میں ''فنا،، کر دینے سے پیدا ہوتی ہے، اور یہ ''فنا،، ''ذات باری،، میں ہے، نہ ''احکام باری تعالیٰ،، میں،، ۔

ان کے نزدیک یہ ''فنا،، یا ''بیخودی،، مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے نہایت مضر ہے، اور ''فنا،، اور ''بیخودی،، کی یہ ''وحدت الوجودی،، تفسیر بقول ان کے ''بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی ۔،، اسلئے ان کی تمام تحریریں اس تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں ۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال کے عقیدہ میں ''فنا،، کے معنی ''فنا فی احکام اللہ،، ہے نہ کہ ''فنا فی ذات اللہ،، جیسا کہ صوفیا کا عام مسلک ہے ۔ اسلئے ان کے نزدیک ''اتحاد بذات حق،، کوئی شے نہیں ۔ انسان ایک خاص ''انفرادی شخصیت،، کا مالک ہے ۔ اس کی اس ''انفرادی

حیثیت،، اور خدا کی ''انفرادیت،، میں کوئی تضاد نہیں۔ خدا ایک کامل ترین ''فرد،، ہے۔ لا محالہ انسان اور خدا کے مابین جو نسبت ہے، وہ ''عبدیت،، کی نسبت ہے، نہ ''عینیت،، کی۔ انسان عابد ہے، اور خدا معبود۔

حدیث شریف میں آیا ہے : لولاک لما خلقت الافلاک (اگر تو نہ ہوتا، تو ھرگز میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا) اس کے مطابق مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنی ''خودی،، کو فاش تر دیکھے۔ اس میں انسان کی کتنی بزرگی اور عظمت بتائی گئی ہے۔ اس بنا پر ''معرفت خداوندی،، کے لئے اس سے ''اتحاد و اتصال،، پیدا کرنے کی کوشش کی بجائے یہی کہنا مناسب ہے : ما عرفناک حق معرفتک (ہم نے تجھ کو نہیں پہچانا، جس طرح تجھے پہچاننے کا حق ہے)۔

مسلمان را ھمیں عرفان و ادراک — کہ در خود فاش بیند رمز لولاک
خدا اندر قیاس مانہ گنجد — شناس آن را کہ گوید ما عرفناک

(۱۳)

علامہ اقبال نے نظریہ ''وحدت الوجود،، کی جو شدید مخالفت کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے عقیدہ میں ''توحید،، کے مسئلہ میں ''وحدت و کثرت،، کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یعنی یہ بات نہیں کہ ''وحدت،، کے مقابلہ میں ''کثرت،، آتی ہے، اور اسلئے جب تک ''کثرت،، کو نہ مٹایا جائے اس وقت تک صحیح ''وحدت،، قائم نہیں ہو سکتی۔

علامہ اقبال کے نزدیک مسئلہ ''توحید،، میں ''وحدت،، کے مقابلہ میں ''کثرت،، نہیں، بلکہ ''شرک،، آتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے۔ ''قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الھکم الہ واحد۔ فمن کان یرجو لقاء ربہ فالیعمل عملاً صالحاً ولا یشرک بعبادۃ ربہ احداً — (کہہ، بیشک میں تمہاری ھی طرح ایک بشر ھوں۔ مجھ پر یہ وحی کی جاتی ہے۔ بیشک تمہارا معبود ایک ھی معبود ہے۔ پس جو شخص اپنے رب سے ملنے کی امید رکھتا ہے، اسکو چاہئے عمل صالح کرے، اور اپنے رب کی عبادت میں اور کبھی کو شریک نہ کرے) یہی دراصل اسلامی ''توحید،، ہے۔ اس کے لئے ''کثرت،، کو معدوم قرار دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ علامہ اقبال لکھتے ھیں۔

''اسلام کی روح توحید ہے۔ اور اس کی ضد ''کثرت،، نہیں بلکہ ''شرک،،

ہے ۔ خدا انسان اور کائنات کا خالق ہے ۔ اس نے امر ''کن،، سے ان دونوں کو پیدا کیا ہے ۔ ''آمر،، و ''مامور،، اور ''خالق،، و ''مخلوق،، میں کلی مغایرت ہے ۔ ''آمر،، اپنے فعل ''امر،، سے اور ''خالق،، اپنے فعل ''تخلیق،، سے خارج ہے ۔

آمر و خالق برون از امر و خلق ما زشست روزگاران خستہ حلق

''توحید،، کے معاملہ میں اقبال ''ہمہ از اوست،، کے قائل ہیں ۔ ''تخلیق،، کے بعد اگرچہ ''انسان،، ایک ''مستقل وجود،، کا مالک ہوگیا، لیکن اس کا مالک بننا درحقیقت خدا کے فضل و کرم سے ہے ۔ خدا اگر نہ ہوتا، تو اس کا بھی وجود ممکن نہ تھا ۔

خودی را از وجود حق وجودے خودی را از نمود حق نمودے
نمی دانم کہ این تابندہ گوہر کجا بودے اگر دریا نہ بودے

علامہ اقبال کے نزدیک دین اسلام میں ''توحید،، کا یہی مفہوم ہے، جس پر عمل پیرا ہو کر انسان جہاں میں یگانہ و یکتا ہو جاتا ہے ۔

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو ترے دل میں لا شریک لہ

(۱۳)

علامہ اقبال کا ''فلسفۂ خودی،، کیا ہے، اور اس کے صحیح معنی اور لوازمات کیا ہیں، مندرجۂ بالا سطور میں جہاں تک ہوسکا، خود علامہ اقبال ہی کے الفاظ میں بالاختصار بیان کئے گئے، جس سے ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ ''خودی،، کا اصل مفہوم اور اس کی غرض و غایت کیا ہے ۔ لیکن علامہ اقبال کا یہ بہت بڑا المیہ ہے، جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے کہ انہوں نے زندگی بھر اپنی تمامتر توجہات اور کوششیں صرف کرکے اپنے جس نظریۂ ''خودی،، کو بین صورت اور واشگاف الفاظ میں، پوری انسانیت، خصوصاً ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود کے لئے پیش کیا تھا، اس کو آج بعض اہل علم ملیا میٹ کرنے اور خاک میں ملانے پر تلے ہوئے ہیں ۔ وہ اس عظیم مقصد کو فوت کرنے پر مصر نظر آتے ہیں، جس کو حاصل کرنے کیلئے علامہ اقبال نے اپنی ساری عمر وقف کردی تھی ۔ وہ مقصد اور کچھ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ انسان، جو ''اشرف المخلوقات،، ہے، اپنے منصب عظمی سے

آگاہ ہو۔ اس مقصد کو واضح کرنے کی خاطر وہ بڑے سے بڑے فلسفی، صوفی اور ہر دلعزیز شاعر پر بھی سخت سے سخت حملہ کرنے سے نہیں چوکے۔ انہوں نے افلاطون اور دوسرے فلسفیوں کے ساتھ ساتھ دنیائے اسلام کی ایک بہت بڑی ہستی شیخ محی الدین ابن عربی رہ پر محض حیات انسانی کے بارے میں ان کے خاص نقطہ نظر کی وجہ سے، کڑی تنقید کی۔ انہوں نے لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی کو بھی معاف نہیں کیا۔ ان کے بارے میں بھی انہوں نے ایسے سخت کلمات استعمال کئے کہ خواجہ حافظ کے عقیدت مندوں کی، جو تمام اسلامی ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں، دشمنی مول لی۔

علامہ اقبال ایک عظیم مفکر اور شاعر تھے۔ ان کے بیش بہا افکار و خیالات سے لوگ بقدر حوصلہ فیض حاصل کرتے ہیں۔ کوئی کم، کوئی زیادہ — ان کے عقیدت مند اور شیدائی ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آج شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو، جہاں جوش و خروش کے ساتھ علامہ اقبال کی یاد نہ منائی جاتی ہو، اور ان کی حیات بخش تعلیمات کا ذکر نہ کیا جاتا ہو۔

پس از من شعر من خوانند و دریا بند و می گویند
جہانے را دگر گوں کرد یک مرد خود آگاہے

علامہ اقبال کی اسی عظمت، اور ان سے اسی بے پناہ عقیدت کی بنا پر ان سے متعلق ملک کے اندر اور باہر مختلف زبانوں میں بیشمار کتابیں لکھی گئی ہیں، لکھی جا رہی ہیں، اور آئندہ لکھی جائیں گی۔ یہ واقعی بہت خوش آئند بات ہے۔

لیکن افسوس کہ ہمارے برصغیر پاکستان و ہند کے بعض اہل علم ایسے بھی ہیں، جو ان کی تعلیمات کو غلط طریقے سے پیش کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں صرف دو آدمیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ہیں، دوسرے پروفیسر یوسف سلیم صاحب چشتی۔ ڈاکٹر میر ولی الدین نے اپنے ایک مضمون 'اقبال کا فلسفۂ خودی' میں ''خودی'' پر اس انداز سے بحث کی ہے کہ علامہ اقبال کے مطمح نظر اور دوسرے ''وحدت الوجودی'' فلسفیوں کے خیالات میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کا فلسفۂ ''خودی'' شیخ محی الدین ابن عربی رہ کی ''وحدت الوجودی'' ، تعلیمات کی صدائے بازگشت ہے۔ نمونہ کے طور پر مندرجۂ ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں :

علامہ اقبال کے تین شعر پیش کرنے کے بعد مذکورۂ بالا مضمون کا آغاز ان الفاظ میں ہوتا ہے :—

''اس جہان رنگ و بو میں کیا کوئی چیز حقیقی کہلائی جا سکتی ہے؟ کیا یہ زمین و آسمان، یہ کاخ و کو حقیقی و واقعی ہیں؟ کیا ان کے وجود میں شک نہیں کیا جا سکتا؟ کیا ان کو حواس کا دھوکا، واھمہ کا آفریدہ نہیں قرار دیا جا سکتا؟ . . . . . .
کیا دور سے بلند مینارے ہمیں مدور نظر نہیں آتے، اور ان ہی کا نزدیک سے مشاھدہ کیا جائے، تو کیا یہ مربع نہیں پائے جاتے؟ . . . . . . اور خواب میں تو ہم کیا نہیں دیکھتے، اور نہایت وضاحت کیساتھ دیکھتے ہیں۔ تا ہم یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ان کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہوتا! کیا یہ ممکن نہیں، خواہ کتنا ہی دور از قیاس کیوں نہ ہو کہ اب بھی خواب ہی دیکھ رہا ہوں، یا جس قلم سے بیٹھا لکھ رہا ہوں، اس کا اور اس سے لکھنے والے ھاتھ کا خارج میں کوئی وجود نہ ہو۔ یہ محض فریب و التباس ہو . . . . . .''

اس کے بعد علامہ اقبال کے یہ تین شعر نقل کئے گئے ہیں :

توان گفتن جہان رنگ و بو نیست زمین و آسمان و کاخ و کو نیست
توان گفتن کہ خوابے یا فسونے است حجاب چہرۂ آں بے چگونے است
توان گفتن ہمہ نیرنگ ہوش است فریب پردہ ھائے چشم و گوش است

اس بیان میں بالکل ''وحدت الوجودی'' انداز پایا جاتا ہے، اور وہ توضیح افلاطون کے نظریہ' تصورات سے ملتی جلتی ہے۔ جہاں تک ''کائنات رنگ و بو'' کا تعلق ہے، علامہ اقبال بھی ان باتوں سے اتفاق کرتے ہیں، جیسا کہ ان کے مندرجہ' بالا اشعار سے ظاہر ہے۔ لیکن جہاں تک انسان اور اس کی ''خودی'' کا تعلق ہے، ان کا نقطہ' نظر بالکل جداگانہ ہے۔ وہ کبھی انسان اور اس کی ''خودی'' کو ہیچ نہیں قرار دیتے۔ چنانچہ ان تین اشعار کے فوراً بعد علامہ اقبال کہتے ہیں :

خودی از کائنات رنگ و بو نیست حواس ماسیاں ماو او نیست

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے اپنے مطلب کے لئے تین شعر تو مثال

کے طور پر پیش کر دیئے، لیکن ان اشعار کے فوراً بعد ''خودی،، کے بارے میں جو شعر تھا، اسے چھوڑ دیا۔ اس لئے کہ وہ ان کے نقطہ' نظر کے خلاف جاتا تھا۔ وہ اگر انسان کو بھی لپیٹ میں نہ لے لیتے، تو ان کا بیان درست تھا۔ مگر تعجب تو یہ ہے کہ وہ خود اپنے وجود کو بھی فریب و التباس قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے افلاطونی انداز میں ''خودی،، کی مزید توضیح و تشریح کرتے ہوئے، ''اسرار خودی،، کے ان اشعار کا حوالہ دیا ہے، جن میں ''خودی،، کے وجود کے بارے میں کہا گیا ہے، اور خاص خاص لفظوں کے نیچے اپنے نقطہ' نظر کے مطابق وضاحتی نوٹ دیا ہے :

پیکر هستی ز آثار خودی است — هرچه می بینی ز اسرار خودی است
خودی' مطلق با حق تعالیٰ . . . آثار — حق
خویشتن را چون خودی بیدار کرد — آشکارا عالم پندار کرد
ارادۂ تخلیق کرد
صد جهان پوشیده اندر ذات او — غیر او پیدا است از اثبات او
بحیثیت صور علمیہ — صور علمیہ — تجلی

اوپر کے اشعار میں ''خودی،، کو ڈاکٹر میر ولی الدین نے انائے مطلق سے تعبیر کیا ہے، اور تصورات یا صور علمیہ کی وهی تفسیر اس سے وابستہ کردی، جو فلسفہ' ''وحدت الوجود،، کی بنیاد ہے، اور جس کے خلاف علامہ اقبال نے علم بغاوت بلند کیا۔

اسی مضمون میں آگے چل کر ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

''خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا وجود حق تعالیٰ کے وجود سے ہے (وجود تا بہ) اور ہمارا نمود (ظہور) حق تعالیٰ ہی کی تجلی سے ہے، اور حق تعالیٰ کا ظہور ہماری ہی صورتوں سے ہے۔،، اس کے بعد اپنے تشریحی نوٹ کے ساتھ علامہ اقبال کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں :

خودی را از وجود حق وجودے — خودی را از نمود حق نمودے
(وجود تا بہ) — (ظہور تا بہ)
نمی دانم کہ این تابندہ گوهر — کجا بودے اگر دریا نبودے
(انائے مطلق) — (انائے مطلق)

دوسرے شعر میں تابندہ گوہر اور دریا دونوں کے نیچے انہوں نے ''انائے مطلق،، لکھا ہے، جو بالکل غلط ہے۔ دریا کی تعبیر، ''انائے مطلق،، تو درست ہے، مگر تابندہ گوہر، سے مراد ہرگز ''انائے مطلق،، نہیں، بلکہ انسان کی ''انفرادی خودی،، ہے۔

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے تو خیر صرف ایک مضمون میں فلسفہ ''خودی،، پر بحث کی ہے، جس سے علامہ اقبال کی تعلیمات کو وسیع پیمانے پر نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ لیکن پروفیسر یوسف سلیم صاحب چشتی نے تو کمال کر دیا۔ انہوں نے اس موضوع پر اتنا لکھا کہ شاید ہی کوئی ان کا مقابلہ کر سکے۔ علامہ اقبال کی کوئی تصنیف ایسی نہیں ہے، جس کی انہوں نے شرح نہ لکھی ہو۔ ان شرحوں میں انہوں نے علامہ اقبال کی تعلیمات کو ''وحدت الوجود،، کے رنگ میں پیش کیا اور ان کو اسی افلاطونی گرداب میں لے آئے، جس سے بچ نکلنے کے لئے علامہ اقبال عمر بھر جہاد کرتے رہے۔

اس مضمون میں پروفیسر یوسف سلیم صاحب چشتی کی ان ساری شرحوں کا جائزہ لینا تو در کنار، ایک شرح پر بھی سیر حاصل بحث کرنے کی گنجائش نہیں۔ اسلئے ایک دو مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

اوپر ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کے مضمون پر بحث کرتے ہوئے، ''اسرار خودی،، کے جن اشعار کا حوالہ دیا گیا تھا، یہاں بھی وہی اشعار نقل کئے جاتے ہیں، اور دیکھتے ہیں پروفیسر یوسف سلیم صاحب چشتی نے ان اشعار کی شرح کس طرح کی ہے۔

پیکر ہستی ز آثار خودی است　　　ہر چہ بینی ز اسرار خودی است

پروفیسر موصوف لکھتے ہیں: ''شعر کا مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات، انائے مطلق (خدا) کے عمل کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالی ہی نے اسکو خلعت وجود عنایت کیا ہے۔ یعنی کائنات کا وجود ظلی ہے۔ مستقل بالذات نہیں ہے۔،،

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد　　　آشکارا عالم پندار کرد

اس پر وہ لکھتے ہیں: ''جب انائے مطلق نے تخلیق عالم کا ارادہ فرمایا، تو اس کے ارادہ کی بدولت، اس کا علم ازلی کائنات کی شکل میں آشکارا

ہوگیا۔ یعنی اسکے علم نے خارجی شکل اختیار کر لی۔ عالم پندار سے مراد وہ عالم ہے، جو انائے مطلق کے ذہن میں موجود تھا،،۔

صد جہان پوشیدہ اندر ذات او غیر او پیداست از اثبات او

اس کے معنی وہ یہ تحریر فرماتے ہیں: ''اس کی ذات میں ایسے سینکڑوں جہاں پوشیدہ ہیں، یعنی اسکی قدرت لا محدود ہے، اور اس کے جلوے غیر متناہی ہیں۔ اور جب ہم انائے مطلق کا اثبات کرتے ہیں، تو اسکے ضمن میں انائے مقید کا ثبوت بھی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مطلق کا تصور مقید کے تصور کے بغیر ناممکن ہے،،۔

در جہان تخم خصومت کاشت است خویشتن را غیر خود پنداشت است

اس پر ارشاد ہوتا ہے: ''انائے مقید چونکہ پرتو ہے انائے مطلق کا، اسلئے دراصل وہ غیر نہیں ہے (غیر اللہ کا تو وجود ہی نہیں ہے)، لیکن تعینات کی وجہ سے انائے مطلق نے انائے مقید کو اپنا غیر سمجھ لیا ہے، اور اس وجہ سے کائنات میں خصومت اور پیکار کا رنگ پیدا ہوگیا ہے،،۔

سازد از خود پیکر اغیار را تا فزاید لذت پیکار را

اس شعر کے پہلے مصرع کے بارے میں رقمطراز ہیں: ''اس مصرع میں ''از خود،، کا مفہوم ''اصل نظام عالم از خودی است،، پر غور کرنے سے واضح ہو سکتا ہے۔ یہ کائنات اللہ سے اسی طرح نکلی ہے، جس طرح آم کی گٹھلی یا نیم کی نمکولی سے آم یا نیم کا درخت۔

''انسان کی روح کہیں باہر سے نہیں آتی۔ اللہ ہر شخص کے کالبد میں اپنی ہی روح کا کچھ حصہ پھونک دیتا ہے،،۔

(ملاحظہ ہو، شرح اسرار خودی، صفحہ ۲٦۱ تا ۲٦۰)

(۱٦)

اوپر جن اشعار کی شرح پیش کی گئی ہے ان اشعار سے علامہ اقبال کا ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ ''وحدت الوجود،، کے زیر اثر ''انائے مطلق،، اور ''انائے مقید،، کا جھگڑا کھڑا کر دیا جائے، اور ''خدا،، کو ''خودی،، کا نیا نام دیکر پیش کیا جائے۔ ''خدا،، اپنی جگہ پر موجود ہے۔ اسے ''خودی،، کے تصور میں، جو کہ انسان سے تعلق رکھتا ہے، کھینچ کر لانے کی کوئی

وجہ نظر نہیں آتی ۔ ان اشعار میں تو صرف علامہ اقبال نے ''خودی،، کی اس ہمہ گیر قوت اور اس کی ان عالمگیر اثرات کا ذکر کیا ہے ۔ جو اس میں پنہاں ہیں۔

''خودی،، کی ناقابل تجزیہ قوت یا جذبہ کائنات کی ہر شے میں موجود ہے:

خفتہ در ہر ذرہ نیروئے خودی است

کوہ، دریا، موج، سبزہ، شمع، زمین، مہر وغیرہ ہر شے اس قوت لا متناہی کی حامل ہے :

کوہ چون از خود رود، صحرا شود — شکوہ سنج جو شش دریا شود
موج تا موج است در آغوش بحر — می کند خود را سوار دوش بحر
سبزہ چون تاب دمید از خویش یافت — ہمت او سینۂ گلشن شگافت
شمع ہم خود را بخود زنجیر کرد — خویش را از ذرہ ہا تعمیر کرد
چون زمین بر ہستیٔ خود محکم است — ماہ پابند طواف پیہم است
ہستیٔ مہر از زمین محکم تر است — پس زمین مسحور چشم خاور است

لیکن اس ''خودی،، کا کامل ترین مظہر ''اشرف المخلوقات،، یعنی ''انسان،، ہے ۔ خدا نے اپنے عین فضل و کرم سے ''انسان،، کو اس بیش بہا انعام سے نوازا، تا کہ وہ نیابت الہیہ کے منصب عظمی سے صحیح معنوں میں عہدہ برآ ہوسکے ۔

علامہ اقبال کے فلسفہ کی ''وحدت الوجودی،، تعبیر جیسا کہ پروفیسر صاحب نے کی ہے، بالکل حقیقت کے خلاف ہے ۔

ہمارے یہ محترم بزرگ اگر نظریۂ ''وحدت الوجود،، ہی کو ''حیات،، کی صحیح تعبیر سمجھتے ہیں، تو سمجھا کریں، کون منع کرتا ہے ۔ لیکن اس کے زیر اثر اپنے خیالات کے اظہار کے لئے علامہ اقبال کا سہارا لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے ۔ وہ علامہ اقبال کے فلسفۂ ''خودی،، کے جدید مفہوم کو اگر اپنے عقیدہ کے مطابق نہیں پاتے، تو بہتر ہے ان پر نکتہ چینی کریں، اور ان کے خلاف لکھیں ۔ لیکن علامہ کے خیالات کو غلط طریقہ سے پیش کرنے کا کیا جواز ہو سکتا ہے ؟ علامہ اقبال کی ''خودی،، کی ''وحدت الوجودی،، تعبیر حقیقت کے بالکل منافی ہے ۔